باگھ ،۵۰،

جب اسد کی آنکھ کھلی تو چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ اُس نے باہر دن کے شروع ہونے کی، لوگوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں سُنیں، مگر جہاں وہ پڑا تھا وہاں پر اُسے کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ اس حالت میں بیٹھے بیٹھے اُس کا جسم اکڑ چلا تھا، چنانچہ اُس نے مشکل سے پہلو بدلا، زنجیر کے باعث بازو اور ٹانگ کو جہاں تک پھیلا سکتا تھا پھیلایا اور نقاہت کے مارے سر پتھر پر رکھ کر پھر اونگھنے لگا۔ جب وہ اُٹھا تو اُس کے اردگرد ابھی اندھیری رات تھی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بڑی لمبی نیند سے بیدار ہوا ہے۔ اُس نے حیرت سے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اُسے خیال آیا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے، ایسا خواب جس میں حقیقی اور غیر حقیقی کیفیتیں ایک ساتھ موجود ہیں، جیسے باہر دن کی آوازیں آ رہی ہیں، لوگوں کے باتیں کرنے کی، پرندوں کے اُڑنے کی، پاؤں کی چاپ، برتنوں کی کھڑک، دھوپ میں چمکتی ہوئی آوازیں، اور اندر یہاں پر اندھیری رات ہے۔

مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں جاگ رہا ہوں، اُس نے زنجیروں کو جھٹکا دیا — زنجیریں مجھے لگی ہیں، میری کلائی اور ٹخنے میں گڑی جا رہی ہیں۔ میں پہلو بدل کر سو رہا تھا۔ اب سیدھا ہو گیا ہوں۔ جو خواب میں ابھی دیکھ رہا تھا وہ بھی مجھے یاد ہے۔ کم از کم اس کا آخری حصہ مجھے یاد ہے۔ خواب وہ تھا۔ یہ حقیقت ہے.....
مگر اُس کے دل کا شک رفع نہ ہوا۔ کیا فی الواقع یہ حقیقت ہے؟ اِس غیر حقیقی ماحول کے تاثر نے اسد کی روح پر نامعلوم ہراس طاری کر دیا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے پورے زور سے اپنی زنجیروں کو کھینچا۔ پیشاب والا برتن تلاش کر کے اُس میں پیشاب کیا اور اُٹھا کر پرے رکھ دیا۔ آج کتنے روز ہو گئے اجابت ہوئے؟ اُس نے سوچنے کی کوشش کی، مگر دنوں کا حساب اُس کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ اُسے نہ دن یاد آ رہا تھا نہ تاریخ۔ اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کون سے دن حکیم قتل ہوا تھا۔ وہ دن بھی اُسے یاد نہ آیا۔ یا اللہ، یہ ماجرا کیا ہے! اُس کے ہراس میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسد۔ اسد کریم، اُس نے زیرِ لب دہرایا۔ میں اسد کریم ہوں۔ شدید بے یقینی کی حالت میں اُس نے سوچا کہ اگر اس وقت اُس نے کچھ نہ کیا، ہاتھ پاؤں نہ مارے، تو اس خود رفتگی کی حالت میں شاید اُس کا وجود بھی تحلیل ہو جائے گا۔ اُس نے متعدد بار زور زور سے ہاتھ اور پاؤں کی زنجیروں کو جھٹکے دیے، پھر کان لگا کر سُننے لگا، جیسے اِس اشارے کے جواب کا متوقع ہو۔ اُس نے حکیم کے قتل کے دن والے واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ کئی واقعات اُس کو یاد آئے، مگر اُن کی ترتیب گڈمڈ تھی، ایک سلسلہ دار کڑی کی شکل نہ بنتی تھی، کوئی بعد میں آتے کوئی پہلے۔ مثلاً اُسے یاد نہ آ رہا تھا کہ یاسمین سے اُس کی ملاقات قتل سے

پہلے ہوئی تھی یا بعد میں، اور قتل کا آلہ اُس نے کہاں دیکھا تھا، کہاں رکھا تھا، پھر وہ آلہ کہاں سے برآمد ہوا تھا۔ اُسے اپنے جُرم کا شدید احساس تھا۔ ساتھ ہی اُسے اپنی بے قصوری کا بھی مدھم سا احساس تھا، مگر یہ احساس اُس کی گرفت میں نہ آ رہا تھا۔ اِس ہراس کی کیفیت میں اپنی ذات کی شناخت کرنے اور اس کی نشان دہی کرنے کی خواہش بڑی شدت سے اُبھری۔ اسد کریم، اُس نے کہنا شروع کیا، 'میں اپنے علاج کی خاطر یہاں آیا ہُوں، اس گاؤں میں، گُشدہ میں، اور پکڑ کر قید کر دیا گیا ہوں، اِس تھانے میں۔۔۔۔۔۔ اُسے تھانے کا نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ پھر یاد آ گیا۔ تھانہ کوٹ میر میں۔ تھانہ کوٹ میر کی حوالات میں۔ مجھے ہتھکڑی اور بیڑی ڈال دی گئی ہے' خطرناک مجرم کی طرح۔ آلۂ قتل۔۔۔۔۔۔ یکایک ہوا کے ایک ریلے سے دروازے میں روشنی کی ایک چوکور لکیر اُبھری اور قیدی کی آنکھیں تیزی سے پھسلتی ہوئی جا کر اُس پر گڑ گئیں۔ یہ کیا ہے؟ یہ تو کوئی کپڑا ہے جیسے بھاری پردہ ہو۔ اُس کی نگاہیں تیزی سے مڑ کر روشندان پر پڑیں۔ اُسی ہوا کے جھونکے نے روشندان میں بھی باریک سی سفید چوکھٹ ڈال دی تھی۔ خدایا، باہر تو دن نکلا ہوا ہے۔ کون سا وقت ہو گا، دوپہر کا؟ یہ لوگ اب کون سا کھیل کھیل رہے ہیں میرے ساتھ۔ مجھے اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں؟ ہاں، وہ اپنے آپ سے ہنسا، مجھے اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ خوب۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ کچھ یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔ احمق! پیر کا دن تھا، اور اُسی رات کو حکیم قتل ہوا تھا۔ قتل سے پہلے یا بعد میں کو جنگل میں جا کر میں ملا تھا جہاں سے ہم بارش کے بعد واپس آئے تھے اور واپسی پر مطب میں روشنی دیکھ کر میں وہاں گیا تو میں نے میر حسن کو دیکھا تھا اور حکیم کی لاش اوندھے مُنہ پڑی تھی، اور میرے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ میر حسن اس قتل میں ملوث تھا۔ اُس سے اگلے روز مجھے یہاں لایا گیا تھا، آج پانچواں یا چھٹا دن ہے، یا شاید ساتواں، اِس حساب آج پیر، منگل ہونا چاہیے۔ اور قتل کا آلہ میں نے کہیں دیکھا ہے، نہ رکھا ہے، میں نے کوئی جُرم نہیں کیا۔ مجھے یہاں قید میں رکھ کر تشدد کیا جا رہا ہے اور جھوٹا آلۂ قتل میرے اُوپر ٹھونسنے کی کوشش کی جا رہی ہے، میں بے قصور ہُوں، میرا ان لوگوں سے، ان کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں، میں اپنے علاج کی خاطر یہاں آیا ہُوا ہوں اور اِس واقعے کا گواہ ہوں۔ بس۔ یا اللہ! مجھے کیا ہو گیا تھا۔

چند منٹ کے خلفشار نے اُسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اب اُس کے ذہن میں بکھرے ہُوئے الفاظ، گڈمڈ چہرے، واقعات چشمِ زدن میں جیسے مقناطیسی رَو کے دوڑ جانے سے کھٹاک کھٹاک اپنی اپنی اصلی جگہوں پہ جا کر جم گئے تھے۔ کافی دیر تک وہ اندھیرے میں بیٹھا اپنے حواس درست کرتا رہا۔ اُس کے دماغ کی روشن فضانے نظر کی صفائی کو بحال کر دیا تھا، اور سینے سے ایک بوجھ کے اُٹھنے سے خوشی کی لہر اُس کے اندر دوڑ گئی تھی۔ کوٹھڑی

کا اندھیرا بھی اس وقت اُسے تسکین بخش معلوم ہو رہا تھا۔ اتنے عرصے تک پہریداروں کی ننگی آنکھوں نے اُس کے اندر جو مستقل احساسِ خطر پیدا کر دیا تھا، تاریکی میں وہ کسی قدر معدوم ہو گیا تھا۔ اُس کے ننگے بدن کو تاریکی نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ اسد کو اُن کے پردہ لٹکانے پر کوئی شکایت نہ تھی۔ یہ ٹاٹ تو نہیں ہو سکتا، اُس نے سوچا، ٹاٹ خواہ کتنا بھی موٹا ہو اُس کے سوراخوں سے دن کی روشنی بند نہیں ہوتی۔ ہوا بھی خاصی تیز تھی، پردہ معمولی سا ہلا ہے۔ یا تو یہ کوئی بھاری چیز ہے، کمبل یا لحاف وغیرہ۔ یا اگر ہلکا کپڑا ہے تو چاروں کونوں پر کیل ٹھونک کر دروازے پر منڈھ دیا گیا ہے۔ مگر منڈھ کیسے سکتے ہیں، اندر نہیں آنا انہوں نے؟ کھانا دینے کے لیے، یا تلاشی لینے، اپنی تبدیل کرنے، دھمکیاں دینے، الزام لگانے کے لیے۔ کیا اب یہ مجھے بھوکا رکھیں گے؟ آخر روشنی بند کرنے کا کیا مطلب ہے۔ کہ میں مر جاؤں اور کسی کو پتا نہ چلے؟

اسد نے زور زور سے، ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر زنجیروں کو کھینچنا اور زمین پہ پٹخنا شروع کر دیا۔ دو تین منٹ تک برابر وہ کوٹھڑی میں اسی طرح شور برپا کرتا رہا۔ پھر رُک کر دروازے کو دیکھنے لگا۔ دروازے کے غلاف میں ذرا سی حرکت بھی نہ ہوئی۔ وہ دوبارہ دونوں زنجیروں کو ایک دوسری کے اُوپر بجانے اور پھر زمین پر پٹخنے لگا۔ آخر دروازے پر روشنی کی ایک شعاع پیدا ہوئی۔ پردہ ایک طرف سے ذرا سا اُٹھا اور وہاں سے صرف دو آنکھیں اندر جھانکنے لگیں۔ قیدی نے ہاتھ روک دیا۔ ایک منٹ تک پہریدار کی آنکھیں پردے کی درز میں چمکتی رہیں، پھر غائب ہو گئیں۔ روشنی کی شعاع بند ہو گئی۔ کوٹھڑی میں تاریکی چھا گئی۔ قیدی نے پھر دونوں ہاتھوں میں زنجیریں پکڑ کر انہیں جھنجھنانا شروع کیا۔ جب پردے کا کونا اُٹھا تو وہ رُک گیا۔ دو آنکھوں نے خاموشی سے جھانکا، پھر پردہ گر گیا۔ اسد نے پھر زنجیروں کو کھینچ کھینچ کر بجایا اور رُک کر دروازے کو دیکھنے لگا، جیسے کسی بے زبان جانور سے کھیل رہا ہو۔ کچھ دیر کے بعد وہ اس کھیل سے اُکتا کر پتھر کے ساتھ نیم دراز ہو گیا۔ اب اندر اور باہر مکمل خاموشی تھی۔ پہرے دار کے قدموں کی چاپ بھی نہ تھی۔ سہ پہر کا وقت ہو گا، اُس نے سوچا۔ آج انہوں نے مجھے کھانا بھی نہیں دیا۔ کوئی آیا بھی نہیں۔ یہ کیا حکمتِ عملی ہے؟ پردہ سرکائے جانے سے بہرحال اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک بڑا سا لحاف ہے جو دروازے پر لٹکا ہے، کوئی ٹاٹ واٹ نہیں۔ اور لحاف کو صرف اُوپر سے باندھا گیا تھا، نچلا حصہ اپنے بوجھ سے لٹک رہا تھا۔ لحاف سیاہ رنگ کا تھا، یا گہرے نیلے یا عنابی رنگ کا۔ بہرحال روشنی کو اس نے نہایت کامیابی سے بند کر رکھا تھا، ایک شعاع تک اندر نہیں آ رہی تھی۔ کیسا اندھیرا ہے، اُس نے اپنی آنکھوں کو تاریکی سے مانوس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔ اب دیواروں کی مدھم مدھم حدیں پیدا ہو رہی تھیں۔ مگر اندھیرے میں فاصلے کا تعین نہ ہوتا تھا۔ کبھی یہ حدیں ہٹتے ہٹتے بہت دُور تک چلی جاتیں، اور کبھی معلوم ہوتا کہ بڑھتے بڑھتے

بالکل قریب آگئی ہیں۔ بڑھتے ہوتے وہ اندھیرا جو کچھ دیر پہلے ایک محفوظ اور آرام دہ گھروندے کی مانند اُس کے بے پردہ جسم پر محیط ہو گیا تھا، ایک تنگ و تاریک قبر کی صورت اختیار کرنے لگا۔ اُس کی سانس بھاری ہو چلی تھی۔ کچھ نہ کچھ کرنے کی خاطر اُس نے پیشاب والا برتن اندھیرے میں ڈھونڈ کر اپنے پاس کھینچا اور پاؤں کے بل اُس کے اُوپر بیٹھ گیا۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد اُسے بہت تھوڑی مقدار میں، خشک سی اجابت ہوئی۔ پانچ چھ روز میں پہلی بار اُس کی انتڑیوں میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی تھی۔ اُس نے اطمینان سے برتن پرے رکھا اور پتھر کے اُوپر بیٹھ گیا۔ مگر سانس کی گرانی ختم نہ ہوئی۔ اب دفعتہً اُسے خیال ہوا کہ بالآخر سانس نے اُسے آ ہی لیا ہے، کب تک چھٹی منائے گا۔ سینہ بھرنے لگا تھا، سانس گھٹتی گھٹتی آدھی رہ گئی تھی۔ وہ پتھر پہ سر نیہوڑائے، کہنیاں گھٹنوں پہ رکھے بیٹھا حلق میں پھنسی ہوئی جان کو چھوٹے چھوٹے، تیز تیز دھکے دیتا رہا۔ کافی وقت اسی طرح گزر گیا مگر دورے میں کمی نہ آئی۔

جب تھانیدار اور ایک سپاہی دروازے کا لحاف اٹھا کر، قفل کھول کر اندر داخل ہوئے تو اس نے ہاتھوں سے سر اٹھا کر ایک بار ان کی طرف دیکھا اور سر کو پھر ہاتھوں پر ٹیک دیا۔ سپاہی کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ قیدی کے پاس آ کر اس نے لالٹین کی روشنی قیدی کے سر پر ڈالی۔ پھر سپاہی نے جھک کر ایک ہاتھ سے اس کا کمبل جھٹک کر اُتارا، اور اُسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ پھر لالٹین کو اُس کے چہرے کے برابر لا کر اشارے سے مُنہ کھولنے کو کہا۔ اسد نے چند لمحے مُنہ کُھلا رکھا، پھر بند کر لیا۔

"میں دیر تک مُنہ نہیں کھول سکتا۔" اُس نے کہا، "مجھے دَورہ ہو رہا ہے۔"

سپاہی نے اُس کے نچلے جبڑے کو مضبوطی سے ہاتھ کی گرفت میں لیا اور انگلیاں گالوں میں گاڑ کر زبردستی اُس کا مُنہ کھولا۔ مُنہ کے اندر جھانک کر سپاہی لالٹین اٹھائے قیدی کے جسم کا معائنہ کرتا ہوا چاروں طرف گھوم گیا۔ جب اسد گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر جھک کر کھڑا ہوا تو اُسے سانس میں ذرا آسانی محسوس ہوئی۔

"آج ٹٹی کی ہے حرامی نے۔" سپاہی بدمزگی سے بولا۔ پھر وہ عقب سے نکل کر تھانیدار کے پاس آ کھڑا ہوا۔ "کوئی زخم نہیں۔ کوئی ہتھیار نہیں۔" وہ بولا۔

"سیدھا ہو جا۔" تھانیدار نے حکم دیا۔

قیدی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ تھانیدار نے جیب سے وہی تہہ شدہ ملگجا سا کپڑا نکالا اور اُسے کھول کر اندر سے رنگین دستے اور خون آلود پھل والا چاقو برآمد کیا۔

"اب بتا۔ اسے پہچانتا ہے؟" وہ چاقو کو قیدی کے مُنہ کے پاس لے جا کر بولا۔

"نہیں۔"

"تیرے کمرے سے برآمد ہوا ہے۔ کالے ٹرنک میں سے، پہلی جلد والی اُردو انگریزی ڈکشنری کے نیچے

چھپا ہوا تھا۔"

"یہ میرا چاقو نہیں۔ میرے ٹرنک میں کہاں سے آسکتا ہے؟"

"یہ چاقو تو نے شہر سے جس دکان پر خریدا تھا اس کا پتا بھی نکل آیا ہے۔ دکان دار نے تیری نشان دہی کی ہے۔"

قیدی نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیا سر ہلا رہا ہے۔ منہ سے بول۔"

"میں زیادہ نہیں بول سکتا۔ میری سانس رکتی ہے۔"

یہ سن کر تھانیدار کی آنکھوں میں ایک حریصانہ چمک پیدا ہوئی۔ وہ انگیٹھی پھیلا کر، جم کر کھڑا ہو گیا۔

"بول نہیں سکتا تو سچ کیوں نہیں کہہ دیتا۔ تیرا چھٹکارا اسی میں ہے۔"

"میں سچ بول رہا ہوں۔" قیدی کا سینہ دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔

"سارے واقعات تیرے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔ تو قانون کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ تجھے سخت سے سخت سزا دے۔" تھانیدار نے کہا۔

"میرا اس چاقو سے کوئی واسطہ نہیں۔" اسد بولا، "واقعات کا گواہ صرف میں ہوں۔ واقعات میرے خلاف گواہی کیسے دے سکتے ہیں؟ یہ کیسا قانون ہے؟" اس کا دم پھول گیا۔

"یہ دیکھو۔" تھانیدار نے انگلی سے چاقو کے پھل پر خشک خون کے نشان کی طرف اشارہ کیا، "مقتول کی پشت پر زخم اتنا ہی گہرا ہے جتنا یہ نشان۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آلۂ قتل یہی ہے۔"

"ہوگا۔ مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"جب تو دوسری بار اپنی سکیم بنا کر لوٹا تو تو نے یہ چاقو اسی مقصد کے تحت خریدا۔"

ہمیشہ کی طرح، سانس کی لرزش کے آگے، اسد کا ذہن دوپہر کی دھوپ کی مانند صاف شفاف تھا۔

"پہلے روز جو الزام تم نے لگایا تھا،" وہ بولا، "وہ تو تھا کہ میں جب دوسری بار آیا تو میری سکیم صرف اس کے گھر کے اندر رسائی حاصل کرنے کی تھی۔ اب کہتے ہو میں آیا ہی ارادۂ قتل سے تھا؟"

"بالکل۔" تھانیدار بولا، "وہ تو اس وقت کی بات تھی جب تک آلۂ قتل برآمد نہیں ہوا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ تیری سکیم میں شروع سے ارادۂ قتل شامل تھا۔"

"جھوٹ۔"

"تو یہ چاقو تو نے حکیم کا خنجر کرنے کے لیے خریدا تھا؟ نہ تو قصاب نہ شکاری۔ کس مقصد سے تو نے یہ قیمتی چاقو خریدا ہے؟"

"میں نے نہیں خریدا نہیں خریدا۔ میرا اس چاقو سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں نے دیکھا بھی نہیں۔"

"اور جو دکاندار گواہی دے گا پھر؟ پھر بھی انکاری ہوگا؟"

"گواہی میں دوں گا۔" اسد نے کہا، "گواہ میں ہوں۔"

اب اس سے کھڑا نہ رہا جا سکا۔ وہ تھانیدار کے سامنے پتھر پر بیٹھ گیا۔ اپنا سر اس نے ہاتھوں پر رکھ دیا اور مشکل مشکل سانس لینے لگا۔ تھانیدار نے جھک کر کپڑے پہ رکھا ہوا چاقو قیدی کی آنکھوں کے آگے کیا۔

"دیکھ۔ اچھی طرح سے اپنا چاقو دیکھ۔ تو نے اس سے ایک معصوم شخص کی جان لی ہے۔ دیکھ اس کو دیکھ۔ دیکھ یہ تیرا چاقو ہے۔"

سانس کی پورش سے اسد کا دل ڈوبنے لگا۔ اوپر دیکھے بغیر اس نے خاموشی سے نفی میں سر ہلایا۔ پھر دہنا ہاتھ اٹھا کر، گویا تھانیدار کی بات کے جواب میں، پورے زور سے ہتھکڑی کی زنجیر کو دو جھٹکے دیے، جس سے کوٹھڑی میں آہن کی جھنکار بلند ہوئی۔ پھر اس نے کہنی گھٹنے پر رکھ کر سر ہاتھ پہ ٹیک دیا۔ سانس کو جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی نظر اپنے فوطوں پہ پڑی جو عجیب مُردہ شکل میں سکڑے اور ایک طرف کو مڑے ہوئے تھے، اور پہلی بار اسے اپنی عریانی کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے جو اس نے بڑی مشکل سے ضبط کیے۔ تھانیدار نے احتیاط سے چاقو کپڑے میں لپیٹ کر جیب میں رکھا اور کوئی مزید بات کیے بغیر سپاہی کو لے کر باہر نکل گیا۔

جب وہ دروازے کو مقفل کر کے جا رہے تھے تو اسد نے اٹھتے ہوئے پردے سے باہر دھوپ کو دیکھا اور اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ مگر برآمدے کے سایے کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ ابھی صبح کا وقت تھا اور دوپہر میں کم از کم دو گھنٹے باقی تھے۔ لحاف کا پردہ گرا تو اندر تاریکی چھا گئی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ اسی طرح پتھر پہ بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی بھورے رنگ کے پھیکے شوربے کا پیالہ اور جوار کی روٹی لے کر داخل ہوا اور اس کے پاس رکھ کر چلا گیا۔ ایک بار پھر اندھیرا ہو گیا۔ سانس کا یہ ریلا شدید تھا، کئی گھنٹے تک جاری رہا، پھر بہت آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ جب اس کی شدت میں کچھ کمی ہوئی تو اسد نے اندھیرے میں ٹٹول کر شوربے کا پیالہ اٹھایا اور روٹی چبا چبا کر گھونٹ گھونٹ شوربے کے ساتھ نگلنے لگا۔ جب سانس نے ذرا مہلت دی تو وہ کمبلوں میں سر لپیٹ کر سو گیا۔

کئی گھنٹے تک وہ بے سدھ سویا رہا۔ نیند کے دوران اُس کی بچی کھچی سانس اُسے واپس مل گئی۔ جب وہ جاگا تو اُس کے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد اُٹھ رہا تھا۔ کوٹھڑی میں رات پڑی تھی۔ باہر بھی ایک خاموشی کا عالم تھا۔ کسی آواز کی جنبش نہ تھی، جیسے وقت تھم گیا ہو۔ یہ خیال کر کے اسد کو حیرت ہوئی کہ شاید وہ دن بھر سوتا رہا ہے اور اب رات ہو گئی ہے۔ اندھیرے میں اس نے ہاتھ پھیلایا تو اُسے خالی پیالہ اور صبح کی روٹی کا بچا ہوا ٹکڑا زمین پر پڑا ملا، جس سے اُسے اندازہ ہوا کہ شاید ابھی رات نہیں ہوئی، رات کا کھانا نہیں آیا۔ جب لحاف کا پردہ اُٹھا اور دروازہ کھول کر تھانیدار اور سپاہی اندر داخل ہوئے تو اسد نے دیکھا کہ دن کی روشنی ابھی قائم ہے۔

سپاہی نے اس کی پٹی کھول کر زخم کو پیلی دوائی سے صاف کیا اور پٹی دوبارہ اُوپر باندھ دی۔ پھر حسبِ معمول لالٹین کی روشنی میں قیدی کی تلاشی ہوئی۔ پھر وہی آلۂ قتل کی تکرار۔ قیدی نے کہا "میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بے قصور ہوں۔" تھانیدار نے زور سے گھٹنا اُس کی رانوں کے بیچ مارا اور باہر نکل گیا۔ وہ درد کے مارے دُہرا ہوتے ہوتے پتھر پر بیٹھ گیا۔ دروازہ درشتی سے بند ہوا اور کوٹھڑی میں رات پڑ گئی۔ پیشاب کی بُو اب کوٹھڑی میں پھیلنی شروع ہو گئی تھی۔ باہر دن کی روشنی کی ایک جھلک نے اسد کو پریشان کر دیا تھا۔ جب تک لحاف نہ اُٹھا تھا اُسے گمان بھی نہ تھا کہ باہر روشنی آتی ہے، تیرہ گی پہنچ میں اور کوٹھڑی کی رات میں کوئی فرق نہ رہ گیا تھا، جب کہ باہر دن کی روشنی ابھی قائم تھی۔ سونے اور جاگنے کا فرق مٹ چکا تھا، اور باہر کی دُنیا سے اُس کا رشتہ کٹ گیا تھا۔ زندگی ٹھہر گئی تھی۔ یا ختم ہو گئی تھی؟ پتھر پر بیٹھا وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھتا۔ رات کا کھانا کب آئے گا؟ اُسے بھوک قطعاً نہ تھی، مگر لحاف کے پردے کا کونا اُٹھنے کی، دن کی روشنی کی کسی صورت کو دیکھنے کی، کسی آدمی کے اندر آنے اور قیدی کی زندگی کی تصدیق کرنے کی خواہش اُس کے دل میں پیدا ہو رہی تھی۔ ہر چند منٹ کے بعد وہ دہنے ہاتھ اور بائیں پاؤں کی زنجیروں پہ زور مارتا، جیسے کوئی مویشی رسّا تڑانے کی کوشش کر رہا ہو، کبھی آہستہ کبھی بلبلا کر، اور اپنی نیل زدہ کلائی اور ٹخنوں کی ہڈیوں پر لوہے کے کڑوں کی لذیذ کاٹ کا مزا لیتا، جیسے کہ دُنیا سے اُس کا تعلق اب ان زنجیروں کے واسطے سے ہی قائم تھا، باقی زندگی معدوم ہو چکی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اُس پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ جب سے وہ جاگا تھا دل ہی دل میں تھانیدار کی آمد کا متوقع اور منتظر رہا تھا۔ اور جب اُس کی تلاشی ہو چکی، اور خون آلود چاقو کی تکرار ہو چکی، اور وہ یہ کہہ کر کہ میں بے قصور ہوں اپنی مدافعت کر چکا، تو فوطوں پہ چوٹ کھانے کے باوجود، یا شاید اُس کے باعث، اس کے دل کو اطمینان سا ہوا تھا، کہ جیسے کسی نے اُس کے وجود کو تسلیم کرنے کی حامی بھر لی تھی، خواہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی، اگلے دن تک کے لیے، اگلی شام تک کے لیے۔ وقت، اُس نے زنجیروں کو جھنجھنا کر سوچا، اب سب سے اہم شے ہے۔ وقت کا مسئلہ سب سے اہم مسئلہ ہے، وقت پر قابو

پانے کا، وقت کاٹنے کا، وقت حاصل کرنے کا۔ وقت کا استعمال کرنے کا مسئلہ۔ دماغ کو متوازن اور نظر کو صاف رکھنا اصل مقصد ہے، اگر مزاحمت ہاتھ سے چھوٹ گئی تو سب کچھ چھوٹ جائے گا، گواہی آغریں نے دینی ہے، اُس وقت کے لیے مجھے تیار رہنا ہے، اپنے آپ کو حاضر دماغ رکھنا ہے، جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، سچ سچ ہی ہوتا ہے، سب کہی ہوئی باتیں غلط تو نہیں ہوتیں، جب تک غلط ثابت نہ ہو جائیں۔ اور انہیں غلط ثابت کون کرتا ہے۔ وہ جو دماغ کو حاضر اور نظر کو صاف نہیں رکھتا، جو مزاحمت چھوڑ دیتا ہے۔ جی کا نہ چھوڑنا اصل بات ہے۔ اگر میں ان کے آگے کھڑا رہوں تو یہ لوگ میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے، میں نے کچھ نہیں کیا، ان کے پاس کسی بات کا ثبوت نہیں، صرف وقت کی بات ہے، کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ وقت پہ دسترس کیسے حاصل کی جائے؟ کوئی آتا کیوں نہیں۔ اب تو شام پڑ چکی ہوگی .....

جب سپاہی بھورے رنگ کا شوربہ اور جوار کی روٹی لے کر آیا تو قیدی نے ہاتھ بڑھا کر دونوں چیزیں اُس سے پکڑ لیں اور چپا چپا کر روٹی کھانے لگا۔ سپاہی صبح کا خالی برتن اُٹھا کر باہر نکل گیا۔ آہنی کنڈے کے گھسٹنے کی کرخت آواز بلند ہوئی، پردہ اُٹھا اور گر گیا۔ اسد نے مُنہ روک کر ایک لمحے کے لیے باہر ملگجی شام کے رنگ کو دیکھا، پھر اندھیرے میں آہستہ آہستہ روٹی چبانے لگا۔ روٹی میں ملی ہوئی ریت کے ذرّے جب اُس کے دانتوں میں کرکرانے لگتے تو وہ شوربے کے گھونٹ سے نوالے کو نگل جاتا۔ اُسے آج تک پتا نہ چل سکا کہ شوربہ کس چیز کا ہوتا تھا، آلوؤں کا، دال کا، یا کسی سبزی کا۔ نمک اب گھٹتے گھٹتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ فضلے والے برتن کی بُو تیز ہوتی جا رہی تھی۔ آدھا شوربہ پی کر اسد نے باقی کا زمین پر گرا دیا، اور اندھیرے میں پیشاب والے برتن کو شوربے کے خالی پیالے سے ڈھکنے کی کوشش کرنے لگا، تاکہ بُو رُک جائے۔ مگر پیشاب والے برتن کا قُطر بڑا نکلا۔ وہ آدھی بچی ہوئی روٹی کو ایک طرف پھینک کر پتھر سے لگ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پہرہ بدلا، رات کو سلاخیں بجانے والا سپاہی پہرے پر آ کھڑا ہوا۔ اسد کے پاؤں اور کندھے ٹھنڈے ہونے شروع ہو گئے تھے مگر اتنی سکت نہ تھی کہ اُٹھ کر کود پھاند کرتا۔ وہ اپنے آپ کو دونوں کہنیوں میں لپیٹے بیٹھا اونگھتا رہا۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد سپاہی لحاف کے پردے کا کونا اُٹھاتا، لالٹین اُونچی کر کے قیدی کو دیکھتا، اور رائفل کا دستہ دو سلاخوں کے اندر ڈال کر زور زور سے بجانا شروع کر دیتا۔ رات کی خاموشی میں یکبارگی شور کا ایک طوفان کھڑا ہوتا اور اونگھتا ہوا قیدی چونک کر اُٹھ بیٹھتا۔ ایک منٹ کا وہ شور یوں لگتا جیسے کبھی نہ تھمے گا۔

آدھی رات کے قریب اسد اتنے زور سے چونکا کہ نیم خواب کی حالت میں گھٹنوں کے بل اُٹھ کھڑا ہوا۔ جس آواز نے اُسے چونکایا وہ پہرے دار کا شور نہ تھا۔ یہ کسی مرد کے چیخنے کی آواز تھی۔ پہلے یہ

آواز اتنے قریب سے آتی ہوئی معلوم ہوتی جیسے کوٹھڑی میں سے آ رہی ہو۔ اسد نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مل کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ تاریکی میں اُسے کچھ نظر نہ آیا، مگر یہ پتا چل گیا کہ کوٹھڑی خالی ہے۔ اُس کے کان اُس آواز کا پیچھا کرتے کرتے دروازے تک گئے۔ آواز دروازے کے باہر سے آ رہی تھی۔ اُس ٹوٹی پھوٹی، بلبلاتی ہوئی آواز میں ایسی حیوانی سی پُکار تھی کہ اسد بے اختیار اُٹھ کر دروازے کی طرف چل پڑا، مگر قدم اُٹھاتے ہی زمین پر آ رہا۔ اندھیرے میں اُس کے مُنہ سے گالی نکلی اور وہ چاروں ہاتھوں پاؤں پہ چوپاؤں کی طرح کھڑا کھڑا زور زور سے زنجیروں کو جھٹکے دینے لگا۔ آواز کسی جوان آدمی کی بھی نہ تھی بلکہ بھدی اور کرخت سی آواز تھی جس میں کسی چیخ کا توازن اور زیر و بم نہ تھا، بس پھٹتی اور بند ہوتی ہوئی بے ترتیب سی آواز تھی، جیسے کسی ادھیڑ عُمر اکھڑ کسان کو اذیت دی جا رہی ہو، یا کوئی نزع کی حالت میں مُشکل موت مر رہا ہو۔ اِس آواز کے ساتھ کسی اور آواز کی، تماشائی یا ماتمی یا اذیت دینے والی آواز کی آمیزش نہ تھی بلکہ ایک ہی، تنِ تنہا فریادی کی بلبلاہٹ تھی، اتنی خوفناک کہ اسد کی رُوح اُس کے جسم کے اندر سکڑنے لگی۔ یہ آواز ایک تار، کبھی بھاری کبھی تیز اور باریک اور بند ہوتی ہوئی، ماں اور خدا اور آلاتِ تناسل کا نام لیتی، بے ترتیبی سے فریاد کرتی ہوئی اسد کے کانوں پر، اُس کے اعصاب پر یلغار کر رہی تھی، حتّٰی کہ وہ اِس حیوانی کرب کو برداشت نہ کر سکا اور اُس نے کان اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیے اور زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ آواز اب بھی آتی رہی، مگر دبی دبی۔ چند منٹ کے بعد آواز یکدم بند ہو گئی۔ اسد نے ہاتھ کانوں سے ہٹا کر اپنے سانس کی آواز کو سُنا۔ ایسا سکوت تھا کہ اُسے شک ہونے لگا کہ ابھی جو شور اُس نے سُنا محض اُس کا تصور تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا جا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس کا دل اونچی آواز سے دھڑک رہا تھا۔ اس حملے نے اُسے اچانک آ لیا تھا، اُس کا دماغ بھرے ہوئے پھوڑے کی مانند تھرتھرا رہا تھا۔ خدایا، یہ کیسا دوزخ ہے۔ یہاں کوئی سُننے والا نہیں ہے، وہ یہی سوچ رہا تھا کہ چیخیں پھر بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ اب ان میں ایک اور آواز بھی شامل تھی، دھپ دھپ کی آواز جیسے کوئی لکڑی کے بھاری تختے کو اُٹھا اُٹھا کر کسی چیز پہ مار رہا ہو ہر ایک چوٹ کے ساتھ ایک کڑک خنجر کے باریک اور تیز پھل کی مانند سینے کو پھاڑ کر نکلتی اور دُور تک ہوا کو چیرتی ہوئی چلی جاتی۔ اس وقت یہ آواز انسانی اذیت کی آواز ہوتی، جیسے ایک ایک کر کے ہڈیاں ٹوٹ رہی ہوں۔ پھر جب نیچے گرتی تو حیرانی وحشت کی گہری، گنگ تھرتھراہٹ میں بدل جاتی، جیسے مویشیوں کے باڑے سے کبھی زچگی کے کرب کی آوازیں آتی ہیں۔ اسد نے بوکھلاہٹ میں اپنی دونوں زنجیروں کو پکڑ کر کھینچا اور ایک دُوسری کے اُوپر بجانا شروع کر دیا۔ پھر وہ دیوار کے بہت قریب بیٹھ کر پورے زور سے زنجیروں کو پتھر پہ پٹخنے لگا، جیسے کہ اِن کا شور سُن کر کوئی آ جائے گا اور اُن چیخوں کو بند کروا دے گا۔ مگر اُن کے سامنے زنجیروں

کے شور کی کوئی حقیقت نہ نکلی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے زنجیروں کو چھوڑ کر دونوں کمبل اٹھائے اور اپنے اور منہ پر لپیٹ لیے، کمبلوں کے نیچے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونسیں اور سر کو گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گیا۔ آواز پھر بھی آتی رہی۔ اس آواز کو، جو انگلیوں کے راستے بدن میں داخل ہو کر اس کے دل کو کاٹ رہی تھی، روکنے کے لیے اس نے سر گھٹنوں میں دبا دیا۔ جب آواز پھر بھی بند نہ ہوئی تو اس کے دل پر درد کی جگہ بیکسی کا ایک خوف طاری ہونے لگا۔ گھٹنوں کے بیچ جھکتا جھکتا وہ زمین پر گر پڑا۔ زمین پر گر کر وہ بچوں کی طرح لوٹنے اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔

آواز کچھ دیر تک وقفے وقفے پر آتی رہی، پھر بند ہو گئی۔ اس نے انگلیاں کانوں سے نکال دیں، اور تاریکی میں آنکھیں وا کیے، پہلو کے بل زمین پر بے سدھ لیٹا رہا۔ کبھی کبھی کسی کیڑے یا پتنگے کی سرسراہٹ اس کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگتی، وہ چونک کر سر اٹھاتا، ادھر ادھر دیکھتا، پھر سر زمین پر رکھ دیتا۔ ایک دو بار تھکاوٹ کے مارے اس نے آنکھیں بند کیں مگر فوراً ہی گھبرا کر کھول دیں۔ اس کے وجود پر ہراس کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ کئی گھنٹے تک وہ اسی طرح کمبل اوڑھے زمین پر پڑا کسی خوفزدہ مویشی کی طرح کپکپاتا رہا۔ رات نکل گئی۔ باہر دن شروع ہونے کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ مگر اندھیری کوٹھڑی کے اندر قیدی آنکھیں کھولے زمین پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ جب تھانیدار اور ایک سپاہی لحاف کا کونا اٹھا کر اندر داخل ہوئے تو دھوپ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے دل میں مستقل ہلکا ہلکا درد اٹھ رہا تھا۔ سپاہی نے ہاتھ بغلوں میں دے کر قیدی کو اٹھایا اور لالٹین کی روشنی میں چاروں طرف سے اس کی مکمل تلاشی لی۔

"کوئی زخم نہیں۔ کوئی ہتھیار نہیں۔" آخر میں سپاہی نے کہا اور ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔

تھانیدار نے جیب سے لگجا تہہ شدہ بنڈل نکال کر احتیاط سے کھولا اور اس میں سے خون آلود چاقو برآمد کیا۔

"یہ تیری امانت ابھی تک میرے پاس رکھی ہے۔" تھانیدار بولا۔

اسد خاموشی سے چاقو کو دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

"جب تک اسے تسلیم نہیں کرتا تیری امانت میرے پاس رہے گی، اور تو قید میں رہے گا۔"

"یہ میری امانت نہیں۔" اسد نے کہا، "تمہاری اپنی ہے۔"

"اس پہ تمہارا نام لکھا ہوا ہے۔"

"کہاں؟"

"یہاں" تھانیدار نے انگلی سے خون آلود حصے کی طرف اشارہ کرکے کہا، "اِس خون میں تمہارا نام لکھا ہے۔"

"تم نے خود لکھا ہے۔" اسد نے کہا، "تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔"

"تمہارا جرم میرا ثبوت ہے۔ یہ حکیم کا خون میرا ثبوت ہے۔ یاسمین گل میرا ثبوت ہے۔ چاقو پر تمہاری ملکیت میرا ثبوت ہے۔ مسلم بازار کا مولوی محمد حسین دکاندار میرا ثبوت ہے اور کوئی ثبوت مانگتا ہے؟"

"میں کوئی ثبوت نہیں مانگتا۔" اسد نے کہا، "مجھے عدالت میں پیش کرو۔"

اُس کی متوازن آواز میں ایک مستقل زیریں لرزش تھی۔

"عدالت میں بھی پیش کرلیں گے۔" تھانیدار مسکرا کر بولا، "ابھی تو ہمارے کاغذوں میں تیری گرفتاری ہی عمل میں نہیں آئی۔"

"کیوں؟"

"ہا ہا۔" تھانیدار سپاہی کی طرف دیکھ کر ہنسا، "پوچھتا ہے کیوں۔ اس لیے کہ تفتیش ابھی جاری ہے اور تو ابھی مفرور ہے۔ ثبوت ثبوت کرتے ہو، تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ تو یہاں پر موجود ہے۔"

"مجھ پر تشدد ہو رہا ہے۔"

"کیا ثبوت ہے تیرے پاس کہ تشدد ہو رہا ہے؟"

"یہ۔" اسد نے اپنی زنجیریں اُسے دکھائیں۔ پھر ہتھکڑی کھسکا کر کلائی اُس کے آگے کی۔ جو کڑے کی ضربوں سے سُرخ اور نیلی ہو کر سُوج چکی تھی، "اور یہ۔" اس نے اپنے ننگے غلیظ بدن کی طرف اشارہ کیا، "اِس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے؟"

"بالکل۔" تھانیدار نے سر ہلا کر تصدیق کی۔ "ثبوت کے بغیر نہ تیرا وجود ہے نہ میرا، نہ اس مقدمے کا۔"

"میرا اور تمہارا تعلق تشدد پر قائم ہے؟" اسد نے کہا، "اس کے لیے ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"تشدد سے پہلے گرفتاری لازمی ہے۔ گرفتاری اُس وقت تک عمل میں نہیں آتی جب تک کارروائی درج نہ ہو۔ جب تک کارروائی درج نہیں ہوتی ہمارے پاس تیرا کوئی ثبوت نہیں۔ تو ہمیں ہمارا ثبوت دے دے، ہم تجھے تیرا ثبوت دے دیں گے۔ جب تک تو جھوٹ بولتا رہے گا ہم تیرا وجود تسلیم نہیں کریں گے۔ یہاں صرف سچ کا وجود ہے سچ کا۔"

"میں سچ بول رہا ہوں۔" اسد نے چیخ کر کہا، "دیکھ۔" اُس نے بازو تھانیدار کے سامنے پھیلا دیے۔ "دیکھ یہ میرا وجود ہے۔ تم اِس سے انکار نہیں کر سکتے۔ میں بے قصور ہوں۔"

تھانیدار پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اچانک تھکی ہوئی آواز میں بولا: "اچھا، بیٹا۔ یہاں سے نکل کر کہاں جائے گا۔ یہیں پڑا پڑا گل سڑ جائے گا۔" اُس نے احتیاط سے چاقو کپڑے میں لپیٹا اور جیب میں رکھ کر چل دیا۔ دروازے پر مُڑ کر وہ بولا: "مشت زنی زیادہ مت کرنا۔ اندھا ہو جائے گا۔" اور باہر نکل گیا۔

قیدی تاریکی میں ہاتھ لٹکائے کھڑا کپکپاتا رہا۔ اُس نے اپنی زنجیروں کو جھٹکے دے دے کر کلائی اور ٹخنوں پر بیٹھی بیٹھی درد کو محسوس کیا، پھر کمبل اوڑھ کر پتھر پر بیٹھ گیا۔ نیند سے اُس کا سر چکرا رہا تھا، مگر اُس کی آنکھیں بند نہ ہوتی تھیں۔ بے اندازہ بوجھ سے اُس کے پپوٹے ایک لحظے کو گرتے تو وہ ایکدم نیم خواب کی حالت میں پہنچ جاتا اور وہاں عجیب و غریب بھیانک شکلوں والے جانور اُس کی طرف بڑھنے لگتے۔ وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا۔ تھوڑی دیر کے بعد جیسے جیسے ہمت اُس کا ساتھ دیتی، وہ اپنی زنجیروں کو کھینچتا، اُن پہ زور مارتا، پھر کس کس کر کے اپنے سر پہ لگاتا، کہ یہ گندگی کسی طور صاف ہو جائے۔ کبھی ایک زوردار جھٹکا کھا کر اُس کا سر گھومنے لگتا، گو تاریکی میں اس کا احساس اُسے کم ہی ہوتا، صرف گول گول آتشبازی کے چکر اندھیرے میں اُبھرتے، جس سے اُسے پتا چلتا کہ اُس کا سر گھوم رہا ہے۔ کبھی کبھی ان چکروں میں سے مختلف چہرے اُبھرتے: ادھ کھلی بے نور آنکھوں والا اوندھے مُنہ پڑا ہوا چہرہ، پھیپھڑوں کے قدیم بخار سے چمکتی ہوئی آنکھوں والا ستا ہوا چہرہ، یا سیمن کبھی اُس کے پاس آ کھڑی ہوتی، وہ سر جھٹک کر اس شبیہہ کو مٹا دیتا۔ لحاف کا کونا جب اُٹھا تو چکا چوند پیدا ہوئی۔ سپاہی نے اُس کے پاس آ کر بھورے رنگ کے پھیکے شوربے والا پیالہ زمین پر رکھا اور جوار کی روٹی اُسے پکڑائی۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔

پھیکے شوربے کے ساتھ کڑوی، بدبودار روٹی کھاتے ہوئے قیدی نے سوچا، کیا واقعی میرا کوئی وجود نہیں ہے؟ جھوٹ اور سچ کی اصلیت کیا ہے؟ میرا سچ اُن کا جھوٹ ہے، اُن کا سچ میرا جھوٹ۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ کیوں؟ یہ روٹی اس اندھیرے میں مجھے نظر بھی نہیں آ رہی، مگر یہ میرے ہاتھ میں پکڑی ہے اور میں اسے کھا رہا ہوں، اس کا مزا چکھ رہا ہوں، دو سال پرانی کپڑا لگی جوار کی بنی ہے، میرا پیٹ خراب کرے گی مگر کچھ نہ کچھ گرمی بھی پیدا کرے گی۔ اس کی حقیقت سے انکار کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر میرا وجود نہیں تو پھر تشدد کس پہ کیا جا رہا ہے؟

اس خیال پہ وہ دل میں حیران ہوا کہ اُس کے وجود کی تصدیق سی تشدد سے ہوتی تھی۔ اگر میرا سچ، اُس نے سوچا، میرا وجود ہے، تو اس سچ کی بنیاد ہی تشدد پر رکھی ہے۔ ان کے "سچ" کا پول اُن کا تشدد ہی کھول رہا ہے۔ اندھیرے میں ڈال کر وہ مجھے گم نہیں کر سکتے۔

کئی روز کے بعد اُس کا ذہن اس وقت دن کی روشنی کی طرح صاف ہوا تھا۔ نیند اور درد کے اس عالم میں گویا اُس کے دماغ میں ایک نئی کھڑکی وا ہو گئی تھی۔ اُس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دُور نیچے تک دُنیا کی تہہ میں دیکھ سکتا

ہے اور ایسے جیسے بہت قریب سے دیکھ رہا ہو۔ بیٹھے بیٹھے اُس کا کمبل ڈھلک کر کندھوں سے نیچے جا گرا تھا، مگر اس کے کندھے سرد نہ ہوئے، یُوں جیسے اُس کے اندر والی دُھوپ کی حدت سارے جسم میں پھیل رہی تھی۔ اُس کے جسم کی باریک کپکپاہٹ غائب ہو چکی تھی۔ اُس نے دیوار سے ٹیک لگانے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ اپنے بدن کا بوجھ آسانی سے سہارے، پتھر پہ آنکھیں کھولے بیٹھا وہ اُس بلوریں منظر کو دیکھتا رہا۔ کوٹھری کی متعفن تاریکی معدوم ہو گئی تھی۔ اُس کی جگہ اب اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس بے سایہ، روشن مکعب کی فضا تھی جس میں نظر آ رہا جاتی تھی اور وسط میں پتھر پہ بیٹھے ہوئے قیدی کی قدیم شبیہہ گڑی تھی جس کے ہاتھ اور پاؤں میں زنجیریں پڑی تھیں، مگر جس کے بیٹھنے کا انداز نہ بدلا تھا، سر میں جنبش نہ آئی تھی۔ اُس کے سامنے یاسمین کا چہرہ جو کچھ عرصے تک دُھندلایا رہا تھا، اب صاف ہو چلا تھا۔ بیچ مانگ نکلے ہوئے چوڑے سے سر اور کھُلی کھُلی آنکھوں والا لمبا اور پتلا: "بسم چہرہ .....

جب دروازہ کھلا تو اسد اُٹھ کھڑا ہوا۔ باہر شام پڑ رہی تھی۔ تھانیدار اور سپاہی قیدی کو اِس طرح کمبل اتارے تیار کھڑا دیکھ کر ٹھٹک سے گئے۔ تھانیدار کی آنکھوں میں اُمید کی چمک پیدا ہوئی۔

"کیوں،" وہ بولا، "تیار ہو؟"

"کس کے لیے؟"

تھانیدار کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ وہ اپنی جیب تھپتھپاتے ہوئے بولا: "اِس کی ملکیت تسلیم کرنے کے لیے۔"

"تم تشدد کرنے آئے ہو۔" اسد نے کہا، "کرو اور جاؤ۔ میری کوئی ملکیت نہیں۔ مَیں بے قصور ہُوں۔"

تھانیدار کے مُنہ سے ایک گالی نکلی۔ سپاہی نے لالٹین زمین پر رکھ دی اور غیر معمولی درشتی سے قیدی کی تلاشی شروع کر دی۔ جب وہ آگے جھک کر کھڑا تھا تو سپاہی کی اُنگلی کے ٹہوکے سے گھٹنوں کے بل زمین پہ آ رہا۔ پھر تھانیدار گول لپٹا ہوا کپڑا جیب سے نکالے بغیر سپاہی کو لے کر باہر نکل گیا۔ اُس رات کو بھورے رنگ کا شوربہ بھی کڑوا تھا۔ اسد نے ایک گھونٹ چکھا اور زمین پر گرا دیا۔ روٹی اس نے خالی پیالے میں رکھ دی۔ اُس کے پیٹ میں درد کی لہریں برابر اُٹھ رہی تھیں۔ وہ پتھر پہ بیٹھا بوجھل آنکھوں سے دروازے کی جانب دیکھتا رہا۔ خلافِ معمول آج نہ لحاف اُٹھا نہ کسی پہرے دار نے سلاخیں بجائیں۔ اس موت کے سے سکوت میں اسد کے دل میں وسوسے سر اُٹھانے لگے۔ کئی بار اُس نے بازو کی حرکت سے زنجیر کو اُٹھا اُٹھا کر پتھر پہ مارا، مگر دروازے پر جنبش نہ ہُوئی۔ اب اُس کے پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔ اُس نے ایک کمبل نکال کر ٹانگوں پر لپیٹ لیا۔ دُوسرا کمبل اُس نے سر اور کندھوں پر ڈالا اور اُس کے اندر آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی۔ مگر اندر کے اندھیرے کے عفریت بھی باہر کے اندھیرے کے سے پُرخطر

نکلے۔

رات کے کسی وقت دروازہ کھلنے کا شور ہوا۔ قیدی نے سر کمبل سے نکال کر دیکھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک اجنبی، لالٹین اٹھائے دروازہ بھیڑ کر اُس کی طرف آ رہا تھا۔ پہرے دار نے باہر سے دروازہ مقفل کر دیا، اور پردہ گرا کر غائب ہو گیا۔

★ ★ ★ ★ ★

اجنبی شخص اسد کے سامنے کھڑا تھا۔ اسد نے آنکھوں پہ زور دے کر دیکھا تو اُسے یاد آیا کہ یہ وہی شخص تھا جو پہلے یا دوسرے روز اُس کی پیشی کے وقت تھانیدار کے دفتر میں موجود تھا، اور جس کو وہ اس سے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا تھا۔ اُس شخص نے لالٹین زمین پر رکھ دی اور تعفن کی وجہ سے ناک سکیڑ کر کوٹھڑی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس کی نظر قضیے کے برتن پر پڑی۔ ایک قدم آگے بڑھ کر اور ذرا سا جھک کر اُس نے غور سے برتن کو دیکھا اور جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھ لیا۔ پھر وہ برتن کی طرف پُشت کر کے کھڑا ہو گیا۔

"میرا نام ذوالفقار ہے۔" وہ بولا۔

ابھی اُس نے اپنا جملہ بھی پورا نہ کیا تھا کہ اسد کو یاد آیا کہ اُس نے کہاں اُس شخص کو دیکھا تھا۔ اُس کا ذہن کئی برس، اور سیکڑوں کوس، پیچھے کی طرف دوڑ گیا اور وہ حیرت زدہ آنکھوں سے بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ اس شخص کو اسد نے پہلے شہر کے سکول میں دیکھا تھا۔ جب وہ چھٹی میں پڑھتا تھا تو چند مہینے کے لیے یہ آدمی بڑی جماعتوں کا اُستاد مقرر ہو کر اُن کے سکول میں آیا تھا۔ وہ غالباً نویں اور دسویں درجے کو کوئی مضمون پڑھایا کرتا تھا اور جلد ہی نوکری چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اُن قصباتی سکولوں میں ایسے نوجوان اُستاد اکثر آتے جاتے رہتے تھے جو وقت گزارنے کی خاطر یا کسی مجبوری کی بنا پر تھوڑی دیر کے لیے سکول کی نوکری لے لیتے تھے اور پھر بہتر موقع ملنے پر ــــ یا اس کی تلاش میں باہر نکل جاتے تھے۔ ایسے اُستاد سکولوں اور طالب علموں کے مخصوص ماحول کے ساتھ کوئی مستقل تعلق قائم نہ کر پاتے تھے۔ مگر اس آدمی کی شکل اسد کو یاد رہی تھی۔ اُس کی گول گول چمکدار آنکھیں اُس کے چہرے پر ایک دوسرے کے بہت قریب

باگھ

عبداللہ حُس

ـط

ـسین

واقع تھیں، اور گو اُس کا سر بڑا سا تھا مگر گھنے بال، جن میں تقریباً آدھے سفید ہو چکے تھے، ایک سیدھی لائن میں اُ
کے ماتھے پر نیچے تک اُگے ہوئے تھے، جس سے اُس کا ماتھا ایک تنگ سی چوڑی پٹڑی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اُ
کی عمر کا اندازہ مشکل سے ہوتا تھا، گو ظاہر تھا کہ پچیس تیس کے لگ بھگ ہو گی۔ اُس کے جوان چہرے کے اُوپر سفید اور
مضبوط بالوں کی فصل نے اُس کی شکل میں ایک ایسی خاصیت پیدا کر دی تھی جو ایک بار دیکھ لینے کے بعد دوبارہ دیکھنے
پر مجبور کرتی تھی۔

"آپ پولیس کے آدمی ہیں؟" اسد نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں سرکاری ملازم ہوں۔ پولیس سے میرا براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ سب انسپکٹر کلیم
اللہ خان میرا دوست ہے۔"

"پیشاب والے برتن کو آپ صاف کروا سکتے ہیں؟" اسد نے اُس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"کوشش کروں گا۔" اُس نے ایک نظر پیچھے کی طرف ڈال کر منہ پھیر لیا، "تم فضل آباد کے ہو؟"

"ہاں۔ آپ چند مہینوں کے لیے ہمارے سکول میں آئے تھے۔ میں اُس وقت چھٹی میں تھا۔"

ذوالفقار کے لہجے میں ہلکی سی گرمجوشی پیدا ہوئی۔ "تمہاری یادداشت اچھی ہے۔"

"آپ بھی فضل آباد کے ہیں؟" اسد نے پوچھا۔

"نہیں، میں واسل پور کا رہنے والا ہوں۔ اگلے روز میں نے تمہیں سب انسپکٹر کے دفتر میں دیکھا تھا۔
آج میں نے خان صاحب سے چند منٹ کے لیے تم سے ملنے کی اجازت لی ہے۔"

"کیوں؟"

وہ قیدی کے اس سوال پر چونک پڑا۔ "تم میرے علاقے کے آدمی ہو آخر۔ میرا حق بنتا ہے کہ تمہارے
بارے میں دریافت کروں۔ اس کے علاوہ تم ایک تعلیم یافتہ آدمی ہو اور یہاں پر اجنبی ہو۔ تم جیسے لوگ عموماً ایسے جرم
کے مرتکب نہیں ہوتے۔ تاہم۔"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

"تاہم سارے حالات تمہارے خلاف جا رہے ہیں۔"

"حالات کی گواہی آدمی کی گواہی سے برتر ہوتی ہے؟" اسد نے پوچھا، "میں گواہ ہوں۔"

"جب گواہ ایک ہی ہو، اور وہ مشتبہ یا مجرم کی نشان دہی نہ کر سکے، تو قانون کو واقعاتی شہادت کا سہارا
لینا پڑتا ہے۔ تم صرف یہ کہہ کر تو نہیں چھوٹ سکتے کہ میں گواہ ہوں اور مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"میں جرم کا گواہ نہیں، موقعے کا گواہ ہوں۔"

"تو پھر تمہاری بھی واقعاتی شہادت ہوئی اور ان کی بھی واقعاتی شہادت۔ سوال یہ ہے کہ کس کی بات مانی جائے۔"

"میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔"

"کیسی حقیقت؟" ذوالفقار نے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں گرمجوشی کے اثرات غائب ہونے لگے تھے اور آنکھوں میں ایک دوری کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی۔ "حقیقت کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کی حقیقت اس کے اپنے حالات اور واقعات سے بنتی ہے۔ آج یہ لوگ تمہارا جرم ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو قطع نظر اس کے کہ فی الواقع تم نے جرم کیا ہے یا نہیں، تم درحقیقت مجرم قرار پاؤ گے اور مجرم ہی تسلیم کیے جاؤ گے۔ تم پولیس کے ساتھ تعاون کیوں نہیں کرتے؟"

"کیسا تعاون؟"

"مجھے علم ہے کہ اس کیس میں کچھ اور لوگ بھی مشتبہ ہیں۔ تم کسی نہ کسی طرح ان کی نشان دہی کر کے پولیس کی مدد کر سکتے ہو۔"

"میں کسی پر جھوٹا الزام نہیں لگا سکتا۔ جس بات کا مجھے علم نہیں میں کیسے اسے بیان کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہوں؟"

"جھوٹے الزام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں پولیس کی مدد کرنے کا سوال ہے۔ سچائی صرف وہی نہیں ہوتی جو تم نے دیکھی اور جس کا علم تمہارے حافظے میں ہے۔ سچائی ہمیشہ کھوج کر نکالنی پڑتی ہے۔ اسی لیے پولیس کے بعض اقدام ہمیں ناانصافی پر مبنی نظر آتے ہیں، مگر ان کے کام کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ کس قدر مشکل سے ان کا سابقہ ہے۔ تمہارے جیسے گواہوں کی مدد کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہارا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ان کی مدد کرو۔ آگے سزا اور جزا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"تو یہ کیا ہے؟" اسد نے ہاتھ کے جھٹکے سے زنجیر کو کھینچا۔ "اگر سزا اور جزا اللہ کے ہاتھ میں ہے تو یہ سزا کس جرم کی ہے؟"

"بیوقوفی کے جرم کی۔ خدا نے تمہیں اپنے دماغ پہ اختیار دیا ہے۔ مزاحمت تو سب سے زیادہ پتھر کے بت میں ہوتی ہے، مگر ہتھوڑے کی ضربوں سے آخر بت ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ انسان کی برتری یہ ہے کہ اللہ نے اسے دماغ دیا ہے۔ عقل استعمال کرو۔ قانون کے کل پرزوں کی مدد کرو اور خود بچ کر نکل جاؤ۔ اگر تم اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاؤ تو یہی تمہاری بے گناہی کا ثبوت ہو گا۔"

" آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی " اسد نے کہا " آپ کے خیال میں جو بچ نکلتا ہے وہ بے گناہ ہوتا ہے اور جو مارا جاتا ہے وہ گناہ گار ہے یہ تو قانون کو اُلٹا لٹکانے والی بات ہے ۔"

" اونہوں " رومال کو ناک پر رکھے رکھے ذوالفقار نے نفی میں سر ہلایا " اُلٹا لٹکانا تو درکنار ، مَیں قانون کی بات ہی نہیں کر رہا ۔ مَیں تم کو زندگی کا طریقہ بتا رہا ہُوں ، جو قانون سے کہیں زیادہ اہم ہے ۔ قانون اقتدار کی ایک شاخ ہوتی ہے ۔ جب اقتدار کا عہد بدلتا ہے تو قانون بھی بدل جاتا ہے مگر زندگی کا طریقہ ہمیشہ ایک سا رہتا ہے ۔ زندگی میں حالات سے حتی الوسع بچ نکلنا ہی اصل حکمت ہے ۔"

اس کی باتوں نے اسد کو بھول بھلیوں میں ڈال دیا تھا ۔ حقیقت کی ایک انوکھی شکل اس کے سامنے آئی تھی جو اس کے ذہن کو پھسلا رہی تھی گو اپنے دل کی کسی تہہ میں اس کو یہ شک تھا کہ یہ بات سچ نہیں ہو سکتی یا اگر سچ ہے تو درست نہیں ہے ۔ مگر اس شخص کی باتوں میں ایک خاص قسم کی کشش تھی جس نے ، اس حالتِ غیر میں بھی ، اسد کے ذہن کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا ۔ بے انتہا تھکاوٹ کے باوجود وہ چاہتا تھا کہ یہ شخص اپنی گفتگو جاری رکھے ۔ اس کے ذہن کو یہ باتیں جیسے تھپکیاں دے دے کر آرام پہنچا رہی تھیں ۔

" مگر میری حالت سے ان باتوں کا کیا تعلق ؟" اس نے کہا " عہد ۔ اقتدار ۔ قانون ۔ میرا ان سے کیا واسطہ ؟ مَیں تو یہاں —— " اس نے ہتھکڑی کی زنجیر کو جھٹکا دیا " —— قید ہُوں اور مجھ پر تشدد ہو رہا ہے ۔ مجھے آج تھانیدار نے بتایا ہے کہ سرکاری طور پر میری گرفتاری ہی عمل میں نہیں آئی ۔ گویا مَیں یہاں پہ موجود ہی نہیں ہُوں ۔ یہاں کوئی سننے والا نہیں ؟"

" بالکل " اجنبی نے صبر سے سر ہلایا " یہاں کوئی سننے والا نہیں ۔ تم نے پھر کنوئیں کے مینڈک کی سی بات کی ہے ۔ اپنی ذات کی تکلیف کو تم ہر شے پر فوقیت دے رہے ہو ۔ یہ ایک انتہائی خود غرض نقطہ نظر ہے ۔ تمہارے ایک آدمی کی مزاحمت آخر کیا اہمیت رکھتی ہے ۔ کیا تمہارا یہ فرض نہیں کہ تم اپنی افتاد کو پرے رکھ کر اجتماعی جدوجہد میں حصّہ لو ؟"

" کیسی اجتماعی جدوجہد ؟" اسد نے کہا ۔

" یہاں سے بچ کر نکلنا تمہارا اوّلین فرض ہے ۔ اس کا راستہ مَیں نے تمہیں بتا دیا ہے ۔ یہاں سے جان چھڑانے کے بعد تمہارے آگے ایک ہی راستہ ہے ۔ اجتماعی جنگ تاکہ انصاف کی کوئی شکل پیدا کر سکو ۔"

" کیسے ؟"

" تم اس خطّے کے حالات سے ناواقف نہیں ہو ۔ یہاں ایک عظیم جدوجہد جاری ہے ، آج سے

نہیں، بیس سال سے — پچاس سال سے۔ اس جدوجہد کے پیچھے حق اور باطل کی جنگ ہو رہی ہے۔ کسانوں کی، مزدوروں کی، چرواہوں کی، لکڑہاروں اور دستکاروں کی جنگ۔ یہ بدقسمت لوگ جو پیسوں کے عوض ایک ہاتھ سے دُوسرے کو بیچے گئے ہیں اور بندوقوں سے ہانکے جا رہے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اِن کی مدد کریں۔"

"کیسے ؟" اسد نے دہرایا۔

"جیسے بھی کر سکتے ہیں۔ ہر ایک طریقے سے۔ اگر جان بھی دینی پڑے تو کیا۔ جان کی کیا قیمت ہے ؟"

ذوالفقار نے ایک لمحے کو رُک کر متلاشی نظروں سے اسد کی آنکھوں میں دیکھا، پھر ذرا سے بدلے ہُوئے لہجے میں بات جاری رکھّی، "تم اگر یہاں سے کبھی بچ نکلے تو ہماری بہت مدد کر سکتے ہو۔"

"آپ کی ؟" اسد نے حیرت سے پُوچھا، "کس طرح ؟"

"سرحد پار بھیجنے کیلئے ہمیں عموماً گنوار کسان ملتے ہیں۔ جو یا تو پکڑے جاتے ہیں یا بیکار وقت گزار کے واپس آجاتے ہیں۔ تمہارے جیسے پڑھے لکھے لوگ . . . . !"

"آپ فوج میں ہیں ؟" اسد نے پُوچھا۔

"اس بات کو چھوڑو کہ مَیں کس محکمے میں ہُوں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ رہم انہیں ان کے حقِ خود ارادیت کی ذرا سی پہچان بھی کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ م نے بیک جنبش اِس چالیس لاکھ آبادی کو زمانۂ جہالت سے نکال کر بیسویں صدی میں پہنچا دیا ہے۔"

اسد ہکا بکا رہ گیا۔ یہ شخص میرے پیچھے گُھسا ہوا تھا ؟ حکیم نے اس سے کیا کہا ہوگا ؟ یہ کس کی ملازمت رتا ہے۔ پولیس کی ؟ فوج کی ؟ یا کسی اور محکمے کی ؟ یہ ہے کون ؟ اسد کو محسوس ہوا کہ جیسے یہ شخص آسمان کی یں کرتا کرتا زمین پر اُتر آیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی وہ خود جو چند منٹ کے لیے اپنی زنجیریں توڑ کر کھُلی فضا میں لانچیں بھرنے لگا تھا، اپنی اصلی شکل میں دھڑام سے نیچے آگرا ہے۔ اب وہ پھر ایک قیدی تھا۔ اُس کے دل یں اُس اجنبی کے لیے شکایت کا جذبہ پیدا ہوا جو اب ایک عام روزمرّہ کے لہجے میں بات کر رہا تھا: "تمہارے جیسے پڑھے لکھے لوگ . . . . " اور اسد سوچ رہا تھا کہ کیسے ممکن ہے کہ وہ باتیں جن کے اثر سے اِس کوٹھڑی کا ناقابلِ برداشت تعفّن بھی کچھ دیر کے لیے اُڑ گیا تھا، اب بے کھنک اور سپاٹ آوازوں میں بدلتی جا رہی تھیں۔ جب اس نے ذوالفقار کو سوالیہ نظروں سے اپنی طرف تکتے ہُوئے پایا تو بولا: "مَیں کسی جھنجھٹ میں نہیں پھنسنا چاہتا۔"